وفیات

سراج منیر مرحوم

آہستہ برگِ گل بہ فشاں برمزارِ ما
بس نازک است شیشۂ دل درکنارِ ما

ماہ ستمبر کی ستم گاریاں غیر معمولی طور پہ ہمارے صبر کی حدود کو بار بار توڑتی ہیں، ہمارے بہت سے بزرگ اور بہت سے عزیز، بہت سے چاہنے والے اور بہت سے چہیتے، بہت سے اہل دل اور اربابِ قلم اِسی ماہ میں ہم سے جُدا ہوتے رہے۔ یعنی دوسرے مہینوں سے تناسب زیادہ رہا۔

۱۹۹۰ء کے ماہ ستمبر کی ۲۵ کی صبح کو جادۂ حیات کا وہ نامور مسافر ہم سے جُدا ہو گیا، اور ایک خاموش پیغام دے گیا کہ "قیامت کو ملیں گے۔" اور یہاں بے شمار دلوں میں قیامت بپا ہو گئی۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ؕ

سراج منیر مولانا عبدالمتین ہاشمی کے شجرِ علم و تربیت کا بے مثال ثمر تھے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے شہر سید پور سے لاہور آئے اور پھر سارے خاندان کے لیے لاہور ہی گھر بن گیا۔ یہاں تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کیے، مُعلّم بھی بنے، متکلّم بھی زور کے تھے، یہاں تک کہ جب اس دریا کو کنارے روکنے میں ناکام ہو گئے تو اس کا پانی علم، ادب، تہذیب اور تنقید کی سوکھتی کھیتیوں میں پھیل گیا۔

سراج منیر کو علمِ دین اِس سے نہ روک سکا کہ وہ جدید علوم حاصل کرے، مگر دَورِ جدید کی فلسفہ طرازیاں اُسے اس سے باز نہ رکھ سکیں کہ وہ ادب و تنقید کے اس معرکہ زار میں کام کرے جہاں ترقی اور جدیدیت کے نام سے

لا دینیت جھنڈے گاڑ چکی تھی۔ اور ادبی دلچسپیاں اُسے اس بات سے نہ روک سکیں کہ وہ تہذیبِ اسلام اور پاکستان کی نظریاتی ہیئت کا محافظ بنے۔ اس شخص کے ظہور نے (ستر اور اسی کی دہائی میں) ایک تہلکہ برپا کر دیا۔

سراج منیر مرحوم نے ایک عجیب و غریب کتاب بعنوان "ملتِ اسلامیہ ۔ تہذیب و تقدیر" لکھی۔ میں نے اُسے پڑھا تو یوں محسوس کیا کہ اقبال کی کتاب "تشکیلِ جدید، الٰہیاتِ اسلامیہ" کی دوسری کڑی سامنے آئی ہے۔ وہاں شاید عقل پرست سائنسی ماحول میں ایمانیات کو مغرب کے مسلمہ عقلیات کی بنیاد پر استوار کر کے فلسفے کی ایک جدید ترین راہ نکالی گئی تھی۔ اس کتاب کا روئے سخن جس طرح مستشرقین کی طرف تھا، اسی طرح مغربیت کے آسیب زدہ نوجوانوں کی طرف بھی تھا۔ پھر اسی نقطۂ نظر کے تحت بہت پُر زور جذبے سے مثنوی اسرار و رموز لکھی۔

سراج منیر کی کتاب تقریباً اقبال ہی کے فلسفیانہ انداز میں، اور اسی انداز کے الفاظ و اصطلاحات میں لکھی گئی ہے۔ موضوع کا تھوڑا سا فرق ہے۔ تہذیب اسلامی کی ماہیت، اس کا پھیلاؤ، اس کا مختلف مراحل اور علاقوں میں مختلف پیرائے اختیار کرنا، پھر جبر و ظلم کے ماحول میں اس کا ایک سطح سے گم ہو کر دوسری سطح تلاش کر لینا، اور دوسری سطح بھی اگر برقرار نہ رہ سکے تو اُس کے نیچے ایک تیسری سطح پر اپنے نقوش و کردار نئے انداز میں لے آنا ـــ مگر ان ساری سطوح پر اصل جوہر کا محفوظ رہنا اور موقع ملتے ہی از سرِ نو اُبھر آنا، اتنی مختلف بحثیں تاریخ و فلسفہ کی گھلاوٹ اور ادبی و کلامی مہارت کے ساتھ قاری کو قعرِ یاس میں کہیں غوطہ نہیں کھانے دیتیں، بلکہ اسے بار بار تازہ تر شہپرِ اُمید

مہیا کر کے تجدید و احیائے اسلام کے وسیع آفاق میں اُبھارتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے سراج منیر کا ایک مقالہ "ایمانیات اور مابعد الطبیعات" پڑھا تو لکھا:

"شاید ہمارے عصری ادب میں ایک ادیب کی زبان یا قلم سے ایمانیات کی اصطلاح پہلی مرتبہ صادر ہوئی..... آپ کے مضمون سے مجھے ایک نئے عہد کی خوشبو آتی ہے۔"

اور خود سراج منیر نے ایک جملے میں معاصر علم و ادب کی لامقصدیت کو یوں اجاگر کیا ہے:

"زندگی کی تمام سرگرمیوں کی معنویت، طواف کی طرح صرف اس امر سے متعین ہوتی ہے کہ اس کا مرکز کیا ہے؟"

ایسے دل و دماغ اور ایسے گفتار و کردار کے آدمی کا اپنا کام پورا کیے بغیر، اُٹھا لیا جانا، اُس خوفناک مصیبت کا اندیشہ دلاتا ہے کہ کہیں ہمارا معاشرہ قحط الرجال کے آخری مراحل تک تو پہنچنے والا نہیں ہے۔ جبکہ اس کے حقیقت افروز بزرگوں کے اُٹھ جانے کے بعد نوجوانانِ تہذیب آموز بھی رخصت ہونے لگتے ہیں۔ خدا ہمیں ایسے عذاب سے بچائے، اور سراج منیر پر اپنی بیش از بیش رحمتیں فرمائے اور ان کے والد گرامی اور ان کے پس ماندہ اہل و عیال کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔